جاگتی آنکھوں کا خواب

زاہدہ صدیقی



جاگتی آنکھوں کا خواب

زاہدہ صدیقی

صدیقی پبلیکیشنز چوک اُردو بازار ، لاہور

ضابطہ

طبع — اوّل

تعداد — ایک ہزار

مرتّب — امین صدیقی

مہتمم — جلیل صدیقی

ناشر — محمد یوسف علی صدیقی

قیمت

۲۵ روپے

محمد یوسف علی صدیقی نے نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر
صدیقی پبلیکیشنز چوک اردو بازار لاہور سے شائع کی۔

اِنتساب

والدہ محترمہ کے نام

کہ ——— یہ سایہ ،

خنک میٹھا سایہ ،

مجھے عافیت بخشتا ہے ،

بلاؤں سے ،

جلتے ہوئے سُرخ سُورج کی ،

جُھلسانے والی شُعاعوں سے ،

اور دل کو دہلانے والی ہواؤں سے !

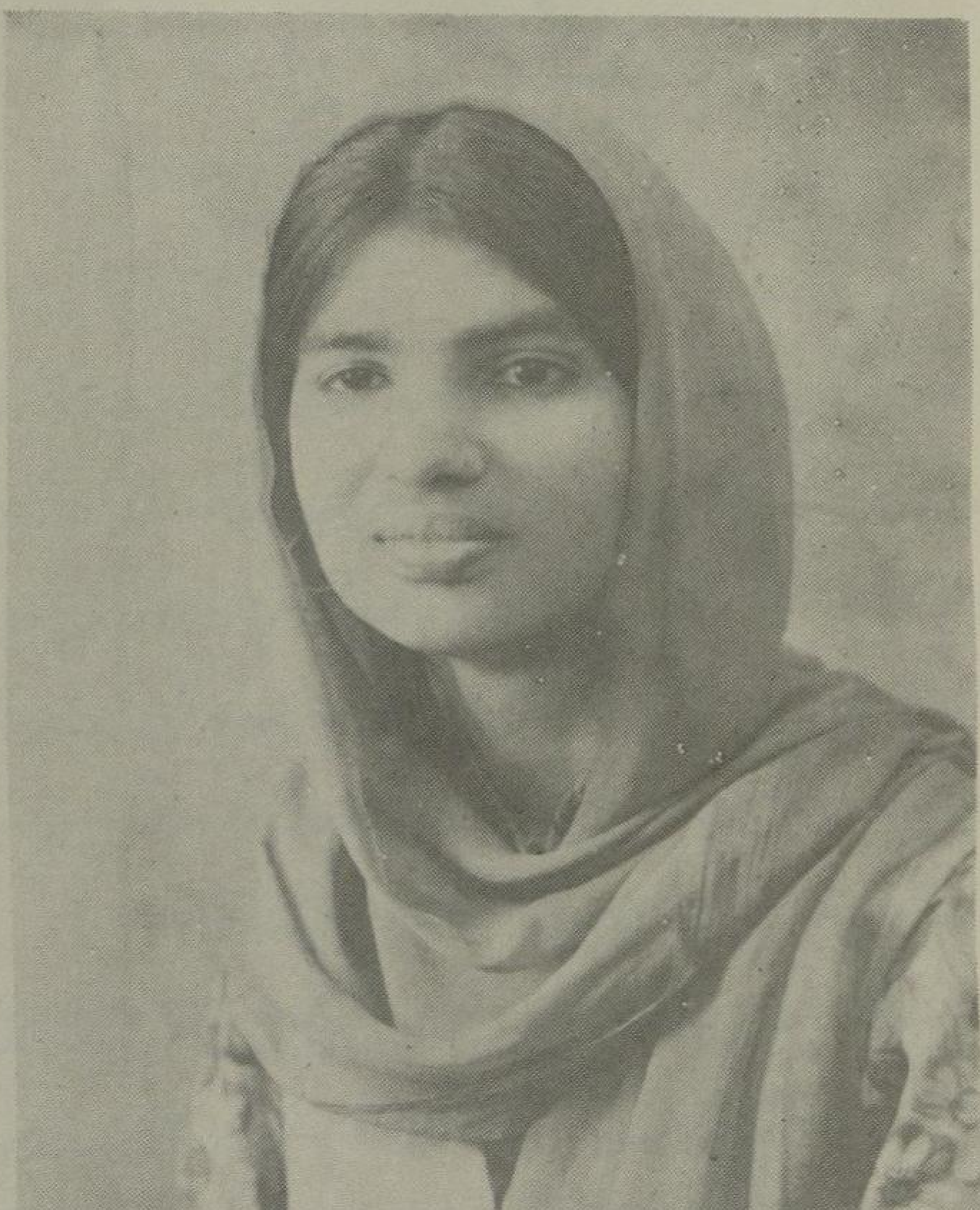
ترتیب

	پیش لفظ (عارف عبدالمتین)	۹
۱	ماں	۱۹
۲	مَیں خوشیوں کی طالب نہیں	۲۲
۳	مَیں پریشاں نہیں	۲۵
۴	اس نئے شہر کو دیکھنے کی تمنّا	۲۷
۵	میرا ایمان	۳۱
۶	دُوسری ٹھنڈی چھاؤں	۳۳
۷	تنہائی	۳۶
۸	بڑا جانگسل مرحلہ ہے	۳۷
۹	نستعلیق کے سب لفظ حرفِ غلط ہیں	۳۹
۱۰	خوشی کے متلاشیوں کے نام	۴۲
۱۱	نئی روشنی کی تمنّا	۴۳
۱۲	جاگتی آنکھوں کا خواب	۴۵
۱۳	۱۹۷۰ء کی آخری نظم	۴۶
۱۴	اجنبی تحریروں کے عنوان	۴۷
۱۵	یقین	۴۸

۱۶	سال کا آخری لمحہ	۴۹
۱۷	ایک احساس	۵۱
۱۸	زندگی	۵۲
۱۹	محرومی	۵۳
۲۰	بے بسی	۵۴
۲۱	یکسانیت	۵۵
۲۲	ناگزیر	۵۶
۲۳	آرزوئے ناتمام	۵۷
۲۴	اُداسی کا گیت	۵۹
۲۵	اندھیرے کا سفر	۶۰
۲۶	حقیقت کا ادراک	۶۱
۲۷	سفرِ رائیگاں	۶۴
۲۸	محبت کے اندر معانی کا گہرا سمندر چھپا ہے	۶۵
۲۹	کلبلاہٹ	۶۷
۳۰	تعبیر	۶۸
۳۱	تلاشِ رائیگاں	۶۹
۳۲	خود کلامی	۷۰
۳۳	ہم سب دُکھی ہیں	۷۱
۳۴	عذابِ مسلسل	۷۲
۳۵	انہیں کیا بتاؤں	۷۳
۳۶	سائے کی جستجو	۷۴
۳۷	آخری صورت	۷۵
۳۸	بے کار خواہشوں کا قصّہ	۷۷
۳۹	ایک تاثر	۷۹

۴۰	اندھیروں کی صدا	۸۰
۴۱	ایک ذاتی نظم	۸۱
۴۲	میرے بس میں نہیں	۸۲
۴۳	روتوں کے سنگ کون	۸۳
۴۴	ایک لامتناہی سوچ	۸۴
۴۵	پورے جسم کی آخری رات	۸۵
۴۶	اب اس وطن پر ہمارا حق ہے	۸۷
۴۷	انہیں مبارک ہو	۹۱
۴۸	چُپ، گہری چُپ	۹۵
۴۹	سال کی آخری سانس	۹۷
۵۰	المیہ	۹۸
۵۱	پوچھنے والا کوئی نہیں ہے	۹۹
۵۲	ازلی جستجو کا نوحہ	۱۰۰
۵۳	شعورِ انا	۱۰۱
۵۴	میرے بھائی	۱۰۴
۵۵	دُوسروں کو سُکھی دیکھنے کی خواہش	۱۰۵
۵۶	بے خطا	۱۰۷
۵۷	اندیشے	۱۰۹
۵۸	آؤ اپنے اپنے اندر جھانک کے دیکھیں	۱۱۰
۵۹	سویرے کا خواب	۱۱۱
۶۰	ذرّوں کے پہاڑ	۱۱۳
۶۱	نئی آزمائش	۱۱۵
۶۲	راستوں کا بوجھ	۱۱۷
۶۳	میں کسی خود فریبی کی قائل نہیں	۱۱۹

۶۴	وجود کا کشف	۱۲۱
۶۵	آئینہ در آئینہ	۱۲۳
۶۶	میں سخن ور نہیں	۱۲۶



پیش لفظ

اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری کی شاہراہ پر فنکاروں کا ایک بہت بڑا کارواں بڑی آن بان کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس کارواں میں جہاں تک شعراء کی تعداد کا تعلق ہے، وہ بڑی تسلّی بخش ہے مگر جہاں تک شاعرات کی تعداد کا تعلق ہے، وہ انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادا جعفری، رشیدہ سلیم سیمیں، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض اس کارواں میں صنفِ نازک کی نمائندگی کا فریضہ بڑی جانکاہی سے سرانجام دے رہی ہیں اور اس لحاظ سے ان کی کاوشوں کو جہاد کا نام دینا کوئی مبالغہ آمیز اظہار نہ ہوگا۔

جب صورتِ حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کارواں میں کسی نئی شاعرہ کا شمول لازماً ایک بڑی خوش آئند بات تصوّر کی جائے گی۔ زاہدہ صدیقی کے حالیہ ورود کو میں نے ایسی ہی ذہنی فضا میں اور ایسے ہی احساسات کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اگرچہ زاہدہ صدیقی کے قدم ابھی اس دشوار گذار راستے پر اس پختہ کارانہ انداز سے نہیں اُٹھ رہے، جس سے کہ ان رہروؤں کے اُٹھ رہے ہیں، جو اپنے تجربے کی بنیاد پر اس کے نشیب و فراز سے کم و بیش آشنا ہو چکے ہیں، تاہم اس کے لہجے کی نسائی توانائی اس امر کا اعتماد بخش ثبوت ہے کہ وہ

بہت جلد اپنی تخلیقی روش کو اس کارواں کی سینیئر ارا کین کی روش سے ہم آہنگ کرے گی۔ لیکن اس ہم آہنگی کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ وہ اپنی اس انفرادیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی، جس کے نقوش اس کے کلام میں ابھی سے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انفرادیت' سفر کے دوران میں، امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مزید نکھر سنور کر نمایاں ہوگی۔

زاہدہ صدیقی سادہ، بے ساختگی اور برجستہ شعریت کے حامل، چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہے مگر یہ اختصار اکثر اس کی طویل سوچ کی غمازی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے فکر کی رفتار اس کی عمر کی رفتار سے تیز تر ہے۔ اس کا دل عنفوانِ شباب کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں اُلجھنے کی بجائے حیات و کائنات کے بڑے بڑے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہمیں اگر کہیں وقت کی گرہیں کھولتی نظر آتی ہے تو کہیں ہم اسے زندگی کی کنہ "محرومی"، "بے بسی"، "یکسانیت"، اور "تنہائی" پر غور کرتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں اور کہیں وہ ہمیں احساس کے اس تپتے صحرا کے اندر کھڑی نظر آتی ہے، جہاں ہر طرف ریت ہی ریت اُڑ رہی ہے، جہاں ہر سمت بگولے ہی بگولے رواں دواں ہیں اور جہاں وہ دو گھڑی کے لئے راحت کی "آرزوئے ناتمام" سے رشتہ استوار کئے ہوئے ہے، جس سے انسان صدیوں سے ناآشنا ہے۔ پھر وہ ہمیں بڑے بالغ نظرانہ انداز میں اس راحت کے حصول کا راستہ بھی سمجھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جب وہ کہتی ہے کہ

خوشی چاہتے ہو
تو دُکھ میں گھرے
اور مسرت سے محروم اس شخص کا ساتھ دو،

جو زمانے کی راہوں پہ تنہا کھڑا ہو
مگر اس کی جانب
کوئی دیکھتا ہی نہ ہو
اور پھر جب
وہی شخص
غم کی گپھا سے نکل کر
انہی اپنے ہاتھوں سے
تم پر کبھی سنگ باری کرے
تو تم اپنے ہونٹوں پہ حرفِ شکایت کبھی آنے نہ دو!

ملاحظہ کیجئے کہ غم زدہ اور محرومِ مسرت انسان کی دستگیری کرنے اور پھر اسی کے ہاتھوں پتھر کھانے پر گلہ مند نہ ہونے کا درس دینا کس پیغمبرانہ اسلوبِ حیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔

یہ سنبھلا ہوا اندازِ فکر جب زندگی کو "جاگتی آنکھوں کا خواب" قرار دیتا ہے اور پھر رنگین خوابوں کو بننے کی تلقین کرتا ہے (خواہ ان کی رنگین تعبیر اپنی قسمت میں ہو یا نہ ہو) تو ہمیں خواب در خواب کا یہ "ناگزیر" سلسلہ ایک باشعور انسان کے اس رویہ کی غمازی کرتا محسوس ہوتا ہے جو دراصل اس عالمِ رنگ و بو میں آدرش کی فعال حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔

مذکورہ رویہ اس صورت میں زیادہ وقیع اور ارفع ہو جاتا ہے جبکہ اس کی حامل شخصیت اپنے آدرش کو حقیقت کا روپ بخشنے کی جدوجہد میں ایک طرف "عذابِ مسلسل" کا شکار ہونے کے باوجود اور انسان ہوتے ہوئے وقتی طور پہ مایوسی کی زد میں آنے کے باوصف اپنی رجائیت پسندی کو قائم و برقرار رکھے اور دوسری طرف وہ حقائق کا سامنا

کرنے کے ضمن میں کسی خود فریبی کی آغوش میں غیر محفوظ پناہ لینے پر آمادہ نہ ہو اور زاہدہ صدیقی کی آواز میں آواز ملا کر پُر اعتماد لہجے میں کہہ سکے کہ "میں کسی خود فریبی کی قائل نہیں!"

زاہدہ صدیقی کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات یا ذاتی محبّت سے قصداً گریز نہیں کیا بلکہ یہ صورتِ حال اس کی ارفع تربیت کا فیضان ہے۔ اس نے شفیق ماں باپ اور جاں نثار بہن بھائیوں کے سہانے سائے میں پرورش پائی ہے، وہ سایہ جس کا امتیازی وصف بے غرض اور بے ریا پیار کی ٹھنڈک مہیا کرنا ہے[1]۔ یہ زاہدہ صدیقی کی خوش بختی ہے کہ اُسے اس گراں مایہ لطف و کرم سے بھرپور اسلوبِ حیات سے متمتع ہونے کا موقع ملا اور یہ اُردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ اس مہر و وفا کو زاہدہ صدیقی نے ایک خوش نہاد ہستی کی حیثیت میں کائنات پر نچھاور کر دیا۔ زاہدہ صدیقی کی وطن سے محبت اور انسان سے دوستی کا منبعِ عظیم یہی شفقت ہے جو اُسے گھر کے آنگن میں میسر آئی اور جسے اُس نے اپنی شخصی ساخت میں بروئے کار آنے والے لطیف ارفع عناصر کی بدولت غیر معمولی توسیع کے درخشاں عمل سے گذارا اور نتیجہ کے طور پر "میں خوشیوں کی طالب نہیں" اور "اس نئے شہر کو دیکھنے کی تمنا" جیسی خوبصورت اور دلپذیر نظمیں وجود میں آئیں۔ زاہدہ صدیقی کی اس آفاق گیر انسانی چاہت کا اندازہ کرنے کے لئے جو شخصی علائق اور اس سے پیدا ہونے والی انسانی حد بندیوں (LIMITATIONS) سے یکسر ما فوق ہے اس کی اوّل الذکر نظم کے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] "مجھے تم سخن ور نہ کہنا"، "میرے بھائی"، "دوسری ٹھنڈی چھاؤں" اور "ماں" جیسی نظمیں میرے اس مفروضے کی صحت پر دال ہیں جو ماں باپ اور بہن بھائیوں کی گھمبیر محبت کے مخلصانہ اعتراف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (عارف)

میں تو ذاتی خوشی کے تصوّر سے ہی
ماورا ہوں
کہ سارے زمانے کی خوشیاں بھی
کوئی اگر میری جھولی میں ڈالے
تو مَیں پھر دُکھی کی دُکھی ہوں
اگر اس زمیں پہ
کوئی ایک بھی شخص
خوشیوں سے محروم ہے
کہ میں صرف اپنے لئے تو نہیں
اس زمینِ مقدس کے ہر شخص کے واسطے
جی رہی ہوں
فقط اپنے دُکھ میں نہیں
اس زمینِ مقدس کے
ہر شخص کے دُکھ کی جلتی چتا میں
کھڑی جل رہی ہوں

مؤخر الذکر نظم در اصل زاہدہ صدیقی کے آدرش کی تجسیم کی حیثیت رکھتی ہے اور جبر و تشدّد، علام ساماں آویزش، استحصال اور تذلیلِ انسانیت پر مبنی موجودہ معاشرے کے مقابلہ میں محنت و محبت، امن و آشتی، اخوت و انصاف اور احترامِ بشریت پہ استوار اس سوسائٹی کا تصوّر پیش کرتی ہے

جو ہر عہد کے انسان کا خواب بنی رہی ہے اور جسے حقیقت کا رُوپ بخشنے کی خاطر اُس نے اب تک ان گنت قربانیاں دی ہیں، مسلسل دئے جا رہا ہے اور متواتر دیتا چلا جائے گا، کیونکہ عملی زندگی میں مذکورہ حقیقت کے رُوپ کی یافت اُسے ہمیشہ اپنے ادھورے پن کا احساس کرواتی ہے اور وہ ہر مرحلے پر عدم تکمیل کے کرب سے دوچار ہو کر اکملیت کے حصول کی جد وجہد میں منہمک ہو جاتا ہے ——— یہی انسان کا مقدّر ہے اور اسی میں اُس کے ارتقاء کا راز بھی مضمر ہے۔ زاہدہ صدیقی کی زبانی اس شہرِ خواب کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

مجھے علم ہے
اک نیا شہر ایسا بھی ہے
جس میں جینے کا معیار بالکل وہی ہے
جو مَیں چاہتی ہوں
وہاں لوگ سب محنتی ہیں
کہ واں عزت و آبرو کی علامت فقط تندہی ہے
وہاں یہ بھی طے ہے
کہ محنت کا بدلہ اُسی شخص کو مل سکے گا
جو محنت کرے گا
اور اتنا ملے گا
کہ جتنے کا وہ خود کو حقدار ثابت کرے گا!

مجھے علم ہے

اس نئے شہر میں امن ہی امن ہے

آدمی آدمی سے ہراساں نہیں ہے

وہاں جنگ کا نام تک بھی کوئی جانتا ہی نہیں

کسی باہمی چپقلش کا نشاں بھی نہیں!

اب ذرا اس شہرِ خواب کے سلسلہ میں ذات کے حوالے سے انسان کی تلاشِ جاوداں کے اظہار کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

مَیں اس شہر کی جستجو میں مسلسل رواں ہوں،

اور اس شہر کو دیکھنے کی تمنّا

مرے دل میں روزِ ازل سے نہاں ہے

سمندر کی اُٹھتی ہوئی تیز موجوں کی صورت رواں ہے!

اور اب مذکورہ شہر کی متواتر گریزپائی اور اس کے باوصف اس کی بازیافت کے ضمن میں انسانی تگ و تاز کے استحکامی پہلو کا مشاہدہ کیجئے:

مرے اپنے اجداد بھی

اس نئے شہر کو دیکھنے کی تمنّا لئے

ایک لمبی مسافت پہ نکلے تھے لیکن

کٹھن راستوں ہی میں گم ہو گئے تھے

کہیں کھو گئے تھے

مجھے حشر اُن کا بھی معلوم ہے

لیکن اس شہر کو دیکھنے کی تمنّا کی شدت کا یہ حال ہے
کہ میں عمر بھر اس کی خاطر کٹھن سے کٹھن راہ پر چلتے رہنے کو تیار ہوں
اور نئے شہر کو جانے والے کٹھن راستے پہ رواں ہوں!

مَیں نے ابھی ابھی ذات کے حوالے سے انسان کی تلاشِ جاوداں کا ذکر کیا تھا۔ تخصیص سے تعمیم کی طرف جانے کا یہ رویّہ صرف اس نظم کے ساتھ خاص نہیں۔ یہ انداز زاہدہ صدیقی کے تخلیقی رویّہ کا انفرادی انگ ہے۔ وہ بالعموم اسے اپنے تجربے کو شخصی سطح سے آفاقی سطح پہ لانے کے لئے بروئے کار لاتی ہے اور یوں اپنی واردات میں پوری نوعِ انسانی کو شریک کر لیتی ہے، اور یہی وہ ہنرمندی ہے جس نے اس کی شاعری کے دائرۂ اثر و نفوذ کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں مدد دی ہے۔

اس رویّہ کی ایک اور مثال اس کی نظم "آرزوئے ناتمام" ہے جس میں زاہدہ صدیقی نے ذاتی حوالے سے زندگی کے مہیب مصائب اور جانکاہ کشمکش کے دوران میں چند لمحاتِ راحت کی ناتمام تمنّا کا اظہار کیا ہے اور نظم کی آخری لائن میں یہ کہہ کر کہ "جس سے صدیوں سے ناآشنا ہے مری زندگی" اس نے نظم کو یک لخت ذاتی سے کائناتی رنگ عطا کر دیا ہے۔ آپ بیتی جگ بیتی کا روپ دھار گئی ہے اور صرف ایک لفظ "صدیوں" کے استعمال سے نظم ایک شخص کی قلمرو سے آزاد ہو کر نوعِ انسانی کی اجتماعی ملکیت میں آگئی ہے ——— اسی طرح کا فنکارانہ موڑ زاہدہ صدیقی نے اپنی نظم "تلاشِ رائیگاں" میں "قرن ہا قرن" کی ترکیب کے توسط سے اچانک کاٹا ہے اور نظم کو فرد کے تصرّف سے نکال کر اجتماع کی تحویل میں دے دیا ہے!

زاہدہ صدیقی کے فن پارے میں ایک خاص بات یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے

کہ ہر چند وُہ انسانی مسائل کی شاعرہ ہے مگر اس نے انہیں فکر کی سطح پر نہیں جذبے کی سطح پر قبول کیا ہے اور اسی سطح پر پیش بھی کیا ہے۔ قبولیت و پیشکش کا یہی انداز فنکارانہ ہے۔ بصورتِ دیگر شاعری شعور و آگہی کی میزان میں تو ٹھیک طور سے تُل جاتی ہے مگر جمالیاتی ترازو میں اس کا پلڑہ لامحالہ ہلکا رہ جاتا ہے!

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ۔ زاہدہ صدیقی نئی شاعری کے نئے امکانات کا دوسرا نام ہے اور مَیں ان امکانات کے جویا کی حیثیت سے اس کا انتہائی گرم جوشی سے استقبال کرتا ہوں۔

ایم۔ اے۔ او کالج
لاہور

عارف عبدالمتین

ماں

مَیں
اک ایسے برگد کی،
میٹھی،
خنک چھاؤں میں جاگزیں ہوں
کہ جس کی ہری ٹہنیوں کے تلے
ایسی آسودگی ہے
جو اس سرزمیں کے کسی دوسرے پیڑ کی،
اس سے زیادہ ہری ٹہنیوں کے تلے بھی نہیں

یہ سایہ،
(خنک میٹھا سایہ)
مجھے عافیت بخشتا ہے
بلاؤں سے،
جلتے ہوئے سُرخ سُورج کی
جُھلسانے والی شعاعوں سے،
اور
دِل کو دہلانے والی ہواؤں سے

مرے دِل میں
یہ آرزو کروٹیں لے رہی ہے
کہ اس مہرباں سبز برگد کی
میٹھی خنک چھاؤں کا
کوئی تو حق ادا کر سکوں ———

مگر
مَیں تہی دست رہرو،
مسافت پہ مجبور ———

وہ سبز برگد،
مسافت کے مارے ہوئے رہرووں کا محافظ
جو سایہ تو بخشے
مگر اپنی خاطر
کبھی راہرووں سے کوئی ٹھنڈا سایہ نہ مانگے
اُنہیں اپنے سائے تلے،
جاگزیں دیکھ کر،
سبز ہوتا رہے ———

مَیں خوشیوں کی طالب نہیں

مِرے واسطے
زندگی میں
خوشی ہو، نہ ہو،
اس سے کوئی غرض ہی نہیں ہے مجھے ——
ذات میری
زمانے میں خوشیوں کی طالب نہیں

مَیں تو
ذاتی خوشی کے تصوّر سے ہی
ماورا ہوں
کہ سارے زمانے کی خوشیاں بھی
کوئی اگر میری جھولی میں ڈالے
تو مَیں پھر دُکھی کی دُکھی ہُوں،
اگر اس زمیں پر
کوئی ایک بھی شخص
خوشیوں سے محروم ہے ــــــــــــــــ
کہ مَیں صرف اپنے لئے تو نہیں،
اس زمینِ مقدّس کے ہر شخص کے واسطے
جی رہی ہوں
فقط اپنے دُکھ میں نہیں،
اس زمینِ مقدّس کے ہر شخص کے دُکھ کی،
جلتی چِتا میں کھڑی جل رہی ہُوں

اگر زندگی میں
کوئی ایسا لمحہ بھی آیا
کہ جب اس وطن کی زمیں پر

دکھ میرے لئے مثلِ آغوشِ مادر ہے)

ہر شخص کے رُخ پہ

وُہ نُور برسا

جو دُکھ سے بری ہونے والوں کے رُخ پر برستا ہے

تو میرے چہرے پہ بھی

خود بخود نور آجائے گا ——————

یہ لمحہ،

مِری زندگانی کا اک لمحۂ جاوداں ہی تو ہوگا

مَیں اُس لمحۂ جاوداں کی سدا منتظِر ہُوں۔

اور اُس لمحۂ جاوداں کے پہنچنے سے پہلے

زمانے میں خوشیوں کی طالب نہیں ——————

میں پریشاں نہیں

مَیں خوش بخت ہُوں
جس کے سر پر
محبت کا وہ ٹھنڈا سایہ سلامت ہے
جس سے زیادہ خنک سائے کا،
اس جہاں میں تصوّر بھی ناپید ہے ———

مَیں خوش بخت ہُوں
جس کے سر پر سلامت ہے
شفقت کا وُہ ہاتھ
جس سے بڑا
اس زمانے میں
یا آنے والے کسی بھی زمانے میں
کوئی سہارا نہیں

تو جب تک مرے سر پہ،
یہ ٹھنڈا سا سایہ سلامت ہے
اور جب تلک سر پہ شفقت کا یہ ہاتھ
موجود ہے،
مَیں بھلا مبتلائے الم کیوں رہوں؟

اُس نئے شہر کو دیکھنے کی تمنّا

مجھے علم ہے
اک نیا شہر ایسا بھی ہے
جس میں جینے کا معیار بالکل وہی ہے۔
جو مَیں چاہتی ہوں ——
وہاں لوگ سب محنتی ہیں
کہ واں عزت و آبرو کی علامت فقط تندہی ہے ——

وہاں یہ بھی طے ہے
کہ محنت کا بدلہ اسی شخص کو مل سکے گا
جو محنت کرے گا
اور اتنا ملے گا
کہ جتنے کا وہ خود کو حقدار ثابت کرے گا

مجھے علم ہے
اُس نئے شہر میں امن ہی امن ہے
آدمی آدمی سے ہراساں نہیں ہے
وہاں جنگ کا نام تک بھی کوئی جانتا ہی نہیں
کسی باہمی چپقلش کا نشاں ہی نہیں
وہاں لوگ اپنے مسائل کے حل باہمی پیار سے ڈھونڈتے ہیں
وہاں ظاہری جاہ و حشمت کا نام و نشاں بھی نہیں ہے
کوئی شخص دولت پہ مرتا نہیں ہے
کہ ان کی نظر میں یہ دولت نشانِ نجابت نہیں ہے
وہاں مرتبوں کا تعین کبھی ظاہری شان و شوکت سے ہوتا نہیں
وہاں عزت و آبرو کے ترازو کے پلڑے،
کبھی مال و دولت کے بڑھنے یا گھٹنے سے گرتے یا اُٹھتے نہیں ہیں

مجھے علم ہے
اُس نئے شہر میں عزّتیں سب کی محفوظ ہیں
کہ وہ لوگ سب عزّت و آبرو کی امانت کے سچّے امیں ہیں

مجھے علم ہے
اس طرح کا نیا شہر ہے تو سہی
کہاں ہے،
میں بالکل نہیں جانتی
وہاں تک پہنچنے میں کتنی منازل کا لمبا سفر ہے،
میں یہ بھی نہیں جانتی
مگر اُس نئے شہر تک جا نکلنے کا رستہ بہت ہی کٹھن ہے،
میں یہ جانتی ہوں
میں اُس شہر کی جستجو میں مسلسل رواں ہوں
کہ اُس شہر کو دیکھنے کی تمنا
مِرے دل میں روزِ ازل سے نہاں ہے،
سمندر کی اُٹھتی ہوئی تیز موجوں کی صورت رواں ہے

مرے اپنے اجداد بھی
اُس نئے شہر کو دیکھنے کی تمنّا لئے

ایک لمبی مسافت پہ نکلے تھے لیکن
کٹھن راستوں ہی میں گم ہو گئے تھے،
کہیں کھو گئے تھے ———

مجھے حشر ان کا بھی معلوم ہے
لیکن اُس شہر کو دیکھنے کی تمنّا کی شدّت کا یہ حال ہے
کہ میں عمر بھر اُس کی خاطر کٹھن سے کٹھن راہ پر چلتے رہنے کو تیار ہوں
اور نئے شہر کو جانے والے کٹھن راستے پر رواں ہوں۔

میرا ایمان

دوستی کا بھرم میرا ایمان ہے
یہ بھرم مَیں نے جس جس طرح سے بھی قائم رکھا ہے
یہ مَیں جانتی ہوں
اور اس کے عوض،
مجھ کو جو کچھ مِلا ہے
مَیں اس سے بھی پُوری طرح آشنا ہوں ——————
مجھے اس کے بدلے میں
آئندہ جو کچھ ملے گا
مَیں اس سے بھی غافل نہیں ——————

مگر اس کے باوصف
میرے ارادے جواں ہیں
کہ میں اس حقیقت سے ہر آن آگاہ ہُوں
کہ جو میرا ایمان ہے
اس کی تہہ میں کسی بھی غرض کا کوئی شائبہ تک نہیں
اور بدلے کی ذرّہ برابر ہوس بھی نہیں ——————

مجھے اس حقیقت کا کوئی قلق تو نہیں ہے
کہ جو میرا ایمان ہے
اکثریت کے دِل اس سے یکسر تہی ہیں
مگر دِل کی گہرائیوں میں
یہ خواہش ہمیشہ رہی ہے
کہ ایمان کی روشنی جو مرے دل کے اندر نہاں ہے
وُہ یُوں پھیل جائے
کہ اس سرزمیں کے ہر اک شخص کا قلب اس سے منوّر ہو
اور پھر وہی اس کا ایمان ہو
روزِ اوّل سے جو میرا ایمان ہے

دوسری ٹھنڈی چھاؤں

وہ،

مری ماں نہیں

ماں کی جائی ہے

لیکن مجھے

ماں کی مانند ہے

مری آنکھ کھلتے ہی

جس نے مجھے

دوسری ٹھنڈی چھاؤں عطا کی تھی

اور شفقتوں کے خزانے لٹائے تھے

وہ آج بھی مجھ پہ

سایہ کناں ہے

بجز مری

ایک ادنیٰ اسی خواہش پہ
سو سو طرح سے فدا ہے
مری آنکھ سے ایک بھی قطرۂ اشک ٹپکے،
تو آنسو بہاتی ہے خوں کے

وہی،
جس نے
میرے لئے
میرے سُکھ کے لئے
اپنے جیون کا سُکھ تج دیا
وہ
مری ماں کی جائی ہے
لیکن مجھے،
ماں کی مانند ہے

جس کی گہری محبّت نے،
شفقت نے،
لاڈوں نے،
اور زندگی کے چلن نے،

سخن کا یہ انداز مجھ کو دیا!

آج
جبکہ مَیں
اس کے برابر ہوں
اس کی محبّت کا، شفقت کا،
اور میٹھے لاڈوں کا
کوئی بدل دینا چاہوں تو ممکن نہیں
رکہ دل کہہ رہا ہے
کہ ان میٹھے اور سچے جذبوں کا
کوئی بدل ہی نہیں
مَیں ان میٹھے اور سچّے جذبوں کا
دل کی تہوں سے
بہت معترف ہوں
اور ان میٹھے اور سچے جذبوں کو
آگے بڑھانے کی کوشش میں مصروف ہوں،
کہ صرف اس قدر ہی میرے بس میں ہے

تنہائی

زندگی کے قافلوں کے درمیاں،
ہم مدّتوں چلتے رہے
چلتے چلتے،
زندگی کی راہ پر،
یک بیک مُڑ کر جو دیکھا
دُور تا حدِّ نظر،
کوئی نہ تھا
اور پھر جو سامنے ڈالی نظر
دُور تا حدِّ نظر کوئی نہ تھا،
کوئی نہ تھا ——
تب ہمیں احساس یہ ہونے لگا،
ہم ہیں صحرا کے شجر
یا شہر کی معروف سڑکوں پر پڑا پتھر کوئی

بڑا جانگسل مرحلہ ہے

بڑا جانگسل مرحلہ ہے
زمانے کی آنکھوں سے انصاف کی روشنی چھن چکی ہے
محبّت کی جتنی شعاعیں تھیں سب بُجھ چکی ہیں
اور اِس کی بجائے
زمانے کی بے رحم آنکھوں میں
خود غرضیوں کے،
تعصّب کے کانٹے اُگے ہیں
کہ جن سے بڑا اور برُا زہر کوئی نہیں ہے
جو سب کے رگ و پے میں رچ بس چکا ہے
کہ جس نے ہمیں
اپنے اجداد کے روبرو

(جو ہم میں نہیں ہیں
مگر ان کی آنکھیں ہمیں دیکھتی ہیں)
آنکھ اُٹھانے کے قابل بھی چھوڑا نہیں ہے

چلو،
ہم ہی تریاق بن جائیں
اس زہر کا،
اور زمانے کی تاریک راہوں کو
مہر و محبّت کے
اور آشتی کے چراغوں سے روشن کریں
کہ یہ مرحلہ جانگسل ہے،
بڑا جانگسل ہے
کہاں تک اسے ہم گوارا کریں گے!

تسلّی کے سب لفظ حرفِ غلط ہیں

سہیلی مری
مہر و اُلفت کا جو لفظ کہتی ہے
اس میں محبت کا جو گہرا جذبہ نہاں ہے
مجھے اس میں ذرّہ برابر بھی شک ہو
یہ ممکن نہیں
وہ مری زیست کی
ٹیڑھی ترچھی سی پگڈنڈیوں کے
ہر اک موڑ پہ
مثلِ سایہ مرے ساتھ ہے
اس کی ہر سانس
میری خوشی کی طلب میں ہے

اور اس کے جیون کا ہر لفظ
میرا ہے، میرے لئے ہے ——————
اس کا دل
میرے ہی درد میں خونچکاں ہے
وہ میری خوشی کی طلب میں ہے
اور اس کی
ہر اک تسلّی
میرے واسطے مژدۂ جانفزا ہے
مری زندگی کے لئے ایک روشن دیا ہے
کہ جس کے سکوں بخش دامن میں
پُر کیف و خوش کن زمانے کی روشن کرن دیکھتی ہوں

مگر
دُوسرے لمحے
صدیوں کی مایوسیاں اور مسائل
صفِ دشمناں کی طرح
راستہ روک لیتے ہیں
اور پھر مَیں
احساس کے تپتے صحرا کے اندر کھڑی

کرب اور گہری مایوسیوں کے ہیولوں میں یکسر گھری

سوچتی ہوں

کہ وہ سارے خاکے

خوشی کے تصوّر کے پردوں میں کیوں چھُپ گئے ہیں

وہ اک آن کی آن میں

کیوں بھلا یُوں بکھر سے گئے ہیں کہ

جیسے کسی زرد بچّے کے ہاتھوں سے

شیشے کا کوئی کھلونا گرے،

ٹوٹ جائے ______

میں اس لمحۂ کرب میں ڈوب کر سوچتی ہوں

مرے دُکھ کا کوئی مداوا نہیں،

تسلّی کے سب لفظ حرفِ غلط ہیں

کہ جو خود فریبی کے پردوں میں کڑوی حقیقت چھپانے کی اک کوششِ رائیگاں ہیں

اُفق تا اُفق پھیلی مایوسیوں اور مسائل کو

پیراہنِ خوشنما بخش کر

ان سے نظریں چرانے کا رستہ دکھانے کی بیکار ترکیب ہیں

خوشی کے متلاشیوں کے نام

خوشی چاہتے ہو،
تو دُکھ میں گھرے
اور مسرت سے محروم اس شخص کا ساتھ دو
جو زمانے کی راہوں پہ تنہا کھڑا ہو
مگر اس کی جانب
کوئی دیکھتا ہی نہ ہو
اور پھر جب
وہی شخص
غم کی گپھا سے نکل کر،
انہی اپنے ہاتھوں سے،
تم پر کبھی سنگباری کرے
تو تم اپنے ہونٹوں پہ حرفِ شکایت کبھی آنے نہ دو

نئی روشنی کی تمنّا

مجھے
آج پھر
اُس نے سمجھایا ہے
بھلا کس لئے اتنی مایوس ہو
اور پریشان ہو
کسی مخلص اور بے غرض دوست کی
چاہتیں جب میسّر ہیں
تو کس لئے تم دُکھی کی دُکھی ہو
یہ توہین ہے دوستی کی

اُسے کیا خبر

خلوص و محبت کی اور آشتی کی ضرورت
مجھے اپنی ہی ذات کے واسطے تو نہیں

مجھے تو زمانے میں
ہر شخص کی آنکھ میں
اس خلوص و محبت کی اور آشتی کی نئی روشنی دیکھنے کی تمنّا ہے

جاگتی آنکھوں کا خواب

زندگی،
اک جاگتی آنکھوں کا خواب
خواب جو دیکھا نہ پہچانا گیا
ایک ساعت
آدمی کو اس کے ہونے کا یقیں
دُوسری ساعت
بکھر جائے فضاؤں میں کہیں
اک دریدہ لب سی آوازِ جرس
جیسے اس کی کوئی منزل ہی نہیں

۱۹۷۰ء کی آخری نظم

بجا ہے
کہ شب ختم ہونے کو ہے
تھوڑی ہی دیر میں
تاج کرنوں کا سر پہ سجائے
اُفق کے سمندر سے
سُورج نکل آئے گا
لیکن
اس کے نکلتے ہی
ہر گوشۂ تار
روشن بھی ہو جائے گا
یہ ضروری نہیں ــــــــــــ

اجنبی تحریروں کے عنوان

کون سمجھے،
کون سمجھائے
کہ ہم کیا راز ہیں
کس اجنبی تحریر کے عنوان ہیں
چلتے پھرتے،
جاگتے جسموں کے ساتھ
ہم ازل سے
کس سہانے خواب کی تعبیر میں مصروف ہیں

یقین

مجھے روزِ روشن کی صُورت یقیں ہے
کہ مَیں خواہشوں میں عبث ہی مقید نہیں ہُوں
حصول ان کا میرا مقدّر رہے ——————
مجھے زندگی کی حقیقت کی صورت یقیں ہے
کہ مَیں جس سفر پہ رواں ہُوں
وُہ ہر آن
منزل کی جانب لئے جا رہا ہے
یہی وُہ یقیں ہے
کہ جس کے سبب اتنی صدیوں کی مایوسیوں
اور مسائل کے انبار کے باوجود
آج بھی پاؤں دھرتی سے اُکھڑے نہیں ہیں

سال کا آخری لمحہ

سال کا آخری لمحہ
جاتے ہوئے
مجھ سے کہنے لگا:
"وقت کا بھوکا عفریت
جو کتنی صدیوں سے
اکھڑ جواں سال لمحوں پہ پلتا رہا ہے
کہ اس کی غذا بھی یہی ہے
یہی اس کو مرغوب ہیں
سال بھر سے
مجھے بھی نگلنے کا خواہاں رہا ہے
وہ خونخوار آنکھوں سے،
جبڑوں کو کھولے ہوئے

میری جانب تکے گا:
تو میں
دیکھتے دیکھتے
خون کے ننھے مُنّے سے قطرے کی مانند
اس کی رگوں میں اُتر جاؤں گا ——
تم کبھی:
مجھ کو،
یا آنے والے جواں سال لمحوں کو
آواز دینے کی کوشش نہ کرنا
کہ تم،
تا ابد بھی پکارو
تو میری
یا اُس کی رگوں میں اُترتے ہوئے
اور لمحوں کی آواز
ہرگز نہیں سُن سکو گے ——"

ایک احساس

صبحِ امّید کی جس کرن کے لئے
ہم سے پہلے بھی کچھ لوگ
تاریک راہوں پہ چلتے رہے
آج ہم بھی
انہی تیرہ و تار راہوں پہ چلتے ہوئے
سوچتے ہیں
کہ شاید
کسی روز اپنا مقدّر بنے
صبحِ امّید کی وہ کرن
جو ابھی تک
نگاہوں سے مستور ہے ——————

زندگی

یہ زندگی ہے
کہ
ایک لمبی کٹھن مسافت کا غیر متناہی سلسلہ ہے
یہاں ہر اک سانس آزمائش
قدم قدم امتحاں گہ ہے

محرومی

بہار،

اپنے دامن میں

کتنے ہی رنگین پیغام لے کر گذرتی ہے

لیکن،

ہمیں کچھ بھی کہتی نہیں ——————

بے بسی

ہم،
مسلسل خزاں کے ہر اک تند جھونکے کو
بھیگی ہوئی آنکھ سے دیکھتے ہیں
مگر،
کچھ بھی کہتے نہیں!
کہہ بھی سکتے نہیں!!

یکسانیت

پھر بہار آئی صحنِ گلشن میں
پھر وہی آرزوئے بخیہ گری
پھر وہی جستجوئے چارہ گراں

ناگزیر

خواب،
کتنا ہی رنگین ہو
کوئی لازم نہیں،
اس کی رنگین تعبیر بھی اپنی قسمت میں ہو
پھر بھی،
تاریکیوں میں
اُجالے کی روشن کرن کی تمنّا لئے
آخری سانس تک
زندگی میں
کوئی خواب بُنتے رہو ———

آرزوئے ناتمام

میں احساس کے تپتے صحرا کے اندر کھڑی ہوں
جہاں ہر طرف ریت ہے
اور بگولے رواں ہیں
بگولے مری سمت آتے ہیں،
مجھ کو اُڑانے کی کوشش میں ہیں
مسلسل تگ و تاز کے باوجود
اب مرے پاؤں دھرتی پہ ٹکتے نہیں
عین ممکن ہے، اب جو
بگولہ کوئی میری جانب بڑھے
تو مجھے ساتھ ہی لے اُڑے

کاش !

اُس تلخ لمحے سے پہلے

بگولوں کا یہ سلسلہ رُک سکے ،

تپتے صحرا کے اندر

جہاں ہر طرف ریت ہے

ٹھنڈے سائے کی صورت بنے

اور اس سائے میں

دو گھڑی کے لئے ،

ایسی راحت ملے

جس سے صدیوں سے ناآشنا ہے مری زندگی

اُداسی کا گیت

کبھی جب
بہت دُور،
اُفق کے چمکتے سمندر کے اُس پار سے
آنے والی سحر کی سپیدی کی کرنیں
نمودار ہوتے ہوئے دیکھتی ہُوں
تو قلبِ شکستہ کے ہر تار میں موجزن،
حسرتوں کی اُداسی
گھڑی دو گھڑی کے لئے
ایک موہوم اُمّید سے آشنا ہونے لگتی ہے
اور سوچتی ہوں
کہ شاید سحر کی سپیدی کی ان ساری کرنوں میں
کوئی کرن ہو مرے نام کی بھی،
چمک جس کی بس میرے ہی واسطے ہو ——————
مگر اس سحر کی سپیدی کی کرنیں
خدا جانے کس کے لئے ہیں،
مرے واسطے تو نہیں ——————

اندھیرے کا سفر

روشنی کی اک کرن کے واسطے
ہم اندھیری راہ پہ ہیں گامزن
لیکن ان تاریک راہوں پر
ہمیں کچھ بھی نظر آتا نہیں
جس طرف ڈالیں نظر،
تاریکیوں کی دُھند سے ٹکرا کے لوٹ آئے وہیں
ہم اگر خود بھی کبھی بولیں
تو اک موہوم سی مُبہم صدا
گونجتی،
اُونچے پہاڑوں پر سے ٹکراتی ہوئی،
اپنی جانب لوٹ آئے
اور پھر
تاریکیوں میں لوٹ جائے
جانے پھر کیسے ہمیں مل پائے گی،
وہ روشنی کی اک کرن

حقیقت کا ادراک

زمانے میں سب سے کٹھن مرحلہ سچ کی پہچان ہے
کہ اس دَور میں،
جھُوٹ اور سچ کی جو ظاہری صورتیں ہیں
وُہ اتنی مماثل ہوئی ہیں
کہ اب عین ممکن ہے
اُس شخص کو بھی
جو سچ کے لیے،
سچ کو ایمان کا درجہ دیتے ہوئے لڑ رہا ہو
غلط سمجھا جائے
اور سچ کے لبادوں میں ملبوس جھُوٹے
جو کثرت میں ہیں
اُن سے نفرت کریں

اُدھر اس کے برعکس اس شخص کو
جس کو سچ سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہ ہو
جھُوٹ کی ظاہری شکل کی روشنی میں
بھلا سمجھا جائے
اور بھلائی کی اس جھُوٹی بنیاد پر،
لائقِ منزلت سمجھا جائے ——

یہ وُہ صورتِ حال ہے
جس پر سنجیدگی سے اگر غور کیجیے
تو اپنے قدم ڈگمگانے لگیں
اور پھر ہم بھی سچ اور سچ کی کٹھن راہ کو چھوڑ دیں
مگر ہم تو اس بات کو اتنی سنجیدگی سے کبھی سوچتے ہی نہیں
کہ ہم جانتے ہیں
کہ پہچان کا یہ کٹھن مرحلہ عارضی ہے
سو ہم اس بُری صورتِ حال میں بھی
سدا سچ پہ قائم ہیں
اور سچ کی خاطر،
برابر لڑے جا رہے ہیں

ہمیں اس حقیقت کا بھی گہرا ادراک ہے
کہ وہ روزِ روشن بہر حال آئے گا
جب جھوٹ اور سچ کی شکلیں مماثل نہ ہوں گی
اُسی روزِ روشن کے ہم منتظر ہیں
اور اس روزِ روشن کی آمد تلک
ہر بُری سے بُری صورتِ حال میں،
اپنی جدوجہد جاری رکھنے کو تیار ہیں

سفرِ رائیگاں

خدایا!
اگر،
آنے کل کی خوشی کا تصوّر
حقیقت نہیں ہے،
فقط اِک سرابِ حقیقت ہے
تو کس لیے
اس کو پانے کی خواہش
مرے دِل میں بڑھتی چلی جا رہی ہے ——
خدایا!
اگر،
آنے کل کی خوشی کا تصوّر
مرے واسطے اجنبی ہے
تو اس کی طلب میں
اذیت کا سارا سفر رائیگاں تو نہیں ہے!
طلب کا ہر اک مرحلہ بے نشاں تو نہیں ہے!

محبّت کے اندر معانی کا گہرا سمندر چھپا ہے

محبّت،

کہ اک لفظ ہے

اپنے اندر معانی کا گہرا سمندر سمیٹے ہوئے ہے

یہ اک مختصر سا مگر بے کراں لفظ ہے

جس کو اپنے رویّے سے تم خود ہی محدود کرتے چلے جا رہے ہو

اور اس کی دل آویز کرنوں سے

صرف اپنے ہی چند رشتوں کو روشن کیے جا رہے ہو

تم اس کو

کہ اس کی حدیں لامکاں سے بھی آگے ہیں

اس طرح محدود کیوں کر رہے ہو

محبّت کے پھیلے ہوئے اور گہرے مطالب کو سمجھو

اور ان پھیلنے والے گہرے مطالب کی کرنوں سے
دُنیا کو روشن کر دو

فقط اپنے بچّے ہی پیارے تمہیں کیوں لگیں
اپنی ہی ماں کو ماں کیوں سمجھتے رہو
فقط اپنی ہی بہن تم کو سدا بہن کیسے لگے
اور فقط اپنے بھائی کو بھائی بھلا کیوں سمجھتے رہو
کہ دھرتی کے سارے ہی بچّے تمہارے ہیں
اور پیار کے مستحق ہیں
سبھی مائیں بہنیں تمہاری ہیں
اور سارے کے سارے باپ اور بھائی تمہارے ہیں
سب پیار کے اور توجہ کے حقدار ہیں
ایک سے پیار کے مستحق ہیں

تم ان سب کے سر پر محبّت کی نورانی کرنوں کی بارش کر دو
اور اندھیروں کے بادل ہٹا دو
کہ سب کے دلوں میں محبّت کا اور آشتی کا نیا راگ جاگے
اور اس راگ سے
سارے عالم کے اندر خوشی کی نئی لہر اُبھرے

کلبلاہٹ

نیند،
مجھے آئے بھی کیسے
جبکہ میرے
چاروں اور ہی
اندیشوں
اور فکروں کی دیوار چُنی ہے
آنکھوں میں
نت نئے، پُرانے
واضح اور موہوم مسائل
کانٹوں کی مانند اُگے ہیں

تعبیر

آنکھ کھلی،
تو ہم نے دیکھا
عزّت چین سبھی کچھ
تالوں کے اندر ہے
اور ہم سیدھے سادے لوگ
جو پیارے پیارے سپنے دیکھا کرتے تھے
اب ان تالوں کی جانب دیکھتے رہتے ہیں
اپنے ہونٹوں،
اور ہاتھوں پر
تالے ہیں ———
ہم خاموش کھڑے ہیں
لیکن
شکر ہے اُس کا
جس نے ہماری سوچوں کو آزاد رکھا

تلاشِ رائیگاں

مرا دِل غرض سے تہی ہے
مَیں اخلاص کی زندہ تصویر ہُوں
روزِ اوّل سے
اُس عالمِ بے غرض کی طلب میں رواں ہُوں
جہاں لوگ ناآشنائے ہوس ہیں،
مری طرح اخلاص کی زندہ تصویر ہیں ——
مگر میں،
قرن ہا قرن کے سفر سے گذر کر بھی،
اُس عالمِ بے غرض کے نشاں تک سے محروم ہُوں
اور تنہا کھڑی ہُوں

خود کلامی

خواہشیں ہیں،
کہ اُڑتے ہوئے بادلوں کی طرح ہیں
اُمنگیں،
گذرتی ہواؤں کی مانند ہیں
اور ہم
بے بسی کے وُہ پیکر
کہ اُڑتے ہوئے بادلوں پہ کوئی اپنا بس ہے
نہ قدرت گذرتی ہواؤں پہ ہے

بھلا ہم کہاں تک
ان اُڑتے ہوئے بادلوں کا تعاقب کریں
کہاں تک
گذرتی ہواؤں کے پیچھے پھریں

ہم سب دُکھی ہیں

زمانے میں
تپتی ہواؤں کے جھونکوں سے ڈرنا،
عبث بات ہے
کہ یاں، کون ہے
جس کو،
تپتی ہواؤں کے جھونکوں کا دھڑکا نہیں ہے
یہاں سب دُکھی ہیں
یہاں سب کے سینوں میں،
غم کی صلیبیں گڑی ہیں
یہاں پر تلاشِ مسیحا بھی یکسر عبث ہے
کہ جب سب دُکھی ہیں
تو اپنے مسیحا بھی ہم آپ ہیں

عذابِ مسلسل

مجھے زندگی میں سکوں کی طلب ہے
سکوں، ؛
جس کا ہر شخص طالب ہے
لیکن،
سکوں کی حقیقت فقط اس قدر ہے
کہ یہ ایک بے جان سا لفظ ہے
جس کے کوئی مطالب نہیں ـــــــــــــ
ایک موہوم سا خواب ہے
جس کی کوئی بھی تعبیر ممکن نہیں ـــــــــــــ

مَیں یہ سوچ کر
اک عذابِ مسلسل سے دوچار ہُوں
اس عذابِ مسلسل کا کوئی مداوا نہیں ـــــــــــــ

اُنہیں کیا بتاؤں ؟

گذرتے ہوئے سارے لمحوں کی
آہٹ کا نغمہ
درِ قلب پر دستکیں دے رہا ہے
چھُپی حسرتوں کی اُداسی کا نوحہ
مجھے روز و شب پُوچھتا ہے
کہ
سُکھ کی کوئی لہر
میرے مقدّر کا حِصّہ بھی ہے
مگر
ان گذرتے ہوُئے سارے لمحوں کی آہٹ کے نغموں،
چھُپی حسرتوں کی اُداسی کے نوحوں کو،
مَیں کیا بتاؤں
کہ اس سے تو مَیں خود بھی ناآشنا ہوُں

سائے کی جستجو

گرمیوں کی کڑی دُھوپ میں بارہا
اُونچے اُونچے درختوں کے سائے تلے
راہرو اپنی منزل کو جاتے ہوئے
رُک کے دم لیتے ہیں
اور کچھ دیر میں
تازہ دم ہو کے پھر
اک نئے عزم سے
اپنی منزل کی جانب نکل جاتے ہیں ——————

کاش، یونہی ہمیں
وقت کی چلچلاتی ہوئی دُھوپ میں
کوئی سایہ ملے،
ذرد ہی کا سہی !

آخری صُورت

ازل سے
مرا دل
زمانے میں
انساں کی انسان سے
بے حِسی، بے رُخی پہ
کُڑھا ہے
ابد تک
یہی کھیل جاری رہے گا
مگر اب مرے جسم میں
اتنی ہمت نہیں ہے
کہ،
انساں کی انسان سے
بے حِسی، بے رُخی کے یہی وار سہتا چلے

ہاں مگر

ایک صورت ہی باقی ہے

چھن جائے احساس کی دولتِ بے بہا مجھ سے

اور اس کے بدلے میں مجھ کو کوئی بخش دے

بے حسی، بے رُخی

ذہن پتھر کا

بیکار خواہشوں کا قصّہ

زمانے کی،
تپتی ہوئی گرم راہوں میں،
گرمِ سفر آدمی کے لئے،
سُکھ کے سائے کی خواہش عبث ہے
کہ عمریں بِتا کر،
اگر سُکھ مِلے بھی
تو قصّہ ہے لمحوں کا

سُکھ، ساعتوں میں گزر جائے
یُوں جیسے پانی کی اک لہر ہو
اور پھر اُس کے آگے
وہی دُکھ کی لمبی مسافت
کہ جو سُکھ کی اس لہر سے پیشتر بھی کٹھن تھی،
پر اتنی نہ تھی

اسی واسطے،
ہم خموشی سے دُکھ کی مسافت کو طے کر رہے ہیں
سکھوں کے تعاقب میں عمریں گنواتے نہیں

ایک تاثر

یہاں پہ،
کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے
یہاں سب کے سب
اپنے اپنے بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں
تمہیں کون پُوچھے؟
تمہیں کون سمجھے؟

اندھیروں کی صدا

زندگی کیا ہے؟
اندھیروں سے جنم لیتی ہوئی،
ایک مبہم سی صدا
اور ~~بے معنی صدا~~
جو چند ساعت گونج کر
تاریکیوں میں ڈوب جائے
اور ابد تک
ان اندھیروں سے کبھی
باہر نہ آئے

ایک ذاتی نظم

وہ مری دوست ہے
آج مَیں اس کی نظروں میں
ہر شے سے بڑھ کر ہوں
اور دوستی اس کی بے لوث ہے
اور مرے واسطے باعثِ فخر ہے
مگر سوچتی ہوں
کہ کیا کل بھی
اُس کا یہی حال ہوگا
کہ یوں بھی ہُوا ہے،
کہ وہ کل جو آتا ہے
گذرے ہوئے کل سے
بالکل نیا رُوپ لے کر،
اُجاگر ہُوا ہے

میرے بس میں نہیں

مری ذات
احساس کا ایک گہرا سمندر رہے
جس کی حدیں اس قدر بے کراں ہیں
کہ اس کی تہوں تک پہنچنا
مرے اپنے بس میں نہیں ———
ذات میری
مرے واسطے
اک سرابِ مسلسل رہی ہے
کہ جس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا
مرے اپنے بس میں نہیں ———

روتوں کے سنگ کون ؟

جیون کی اس پگڈنڈی پہ
اک اک گام پہ
جانے اور انجانے
کتنے دکھ بکھرے ہیں
ہم کو یہ سب جھیل کے بھی
ہنس کر چلتے رہنا ہے
اس سچائی کی تلخی کو سہنا ہے
ہر کوئی ہنستوں کا ساتھی ہے
روتوں کے سنگ کون ؟

ایک لامتناہی سوچ

سیہ رات کی بے کراں خامشی ہر طرف پھیل جاتی ہے
تو میں مقدّر کی کالی رِدا اوڑھ کر،
سوچ کی کالی راہوں پہ آتی ہوں
اور سوچتی ہوں
کہ کیا زندگانی کا حاصل فقط تیرگی ہے
جو روزِ ازل سے
ہمارے تعاقب میں ہے!

پُورے جسم کی آخری رات

نجانے
آج کی شب اور کیا فسوں ٹوٹے
مرے مہکتے ہوئے جسم کا بڑا حصّہ
مرے خود اپنے معالج نے کاٹ ڈالا ہے
مرے بدن میں گڑے ہیں
جُدائی کے کانٹے
جو مستزاد ہیں پہلے تمام زخموں پہ
بدن کے ہر بُنِ مُو پہ اُگی ہوئی ہے آنکھ
اور اس سے خون ٹپکتا ہے،
آگ برستی ہے
شرارے پھوٹ رہے ہیں بدن کی رگ رگ سے
ہوا کچھ اتنی ہے بوجھل

کہ سانس لینا بھی
مرے بدن کے لئے اک بڑا عذاب ہُوا
مہیب اتنا ہے اس سانحے کا کرب کہ اب
بچا ہُوا یہ بدن بھی عذاب لگتا ہے
خدائے ارض و سما
میں نے کب یہ سوچا تھا
کہ میرا اپنا معالج ہی میرا دشمن ہے
وہ اپنے ہاتھوں سے میرے بدن کو کاٹے گا
میں اپنی آنکھ سے
اس روزِ بد کو دیکھوں گی
کہ جس کی صبح سے پہلے ہی میرا جسمِ نحیف
بدن کی سرمئی قاشوں میں بٹ چکا ہو گا
خدائے ارض و سما!
پُورے جسم کی آخری رات،
کٹا ہُوا یہ بدن تجھ سے پُوچھتا ہے بتا
کہ لَوٹ کر کبھی آئے گی وہ سحر کہ نہیں
بدن کی قاشیں بہم مِل کے جب بدن ہو جائیں!

اب اس وطن پر ہمارا حق ہے

ہمارے آباء
وطن کی مٹّی میں
کتنی صدیوں سے
بیج محنت کے بو رہے تھے ——————
وہ خوں پسینہ بہا رہے تھے
مگر وطن پر
انہی کے آباء کی غفلتوں سے
اب ان کا حق اس قدر رہا تھا

کہ اس زمیں پہ
وہ خون چاہیں،
تو خوں بہائیں
پسینہ چاہیں،
تو وہ بہائیں
مگر نہ محنت کا اجر پائیں ——————

انہی کی جھولی میں پل کے ہم نے
جو آنکھ کھولی
تو ہم نے جانا
کہ اس وطن پر
ہمارا حق ہے
اب اس وطن پر
کسی بھی غاصب کا حق نہیں ہے
ہماری محنت،
ہمارا حق ہے
ہماری محنت پہ،
اب کسی دوسرے کا کوئی بھی حق نہیں ہے ——————

سو اب ہمارا وطن،
کہ رقبے میں گھٹ چُکا ہے
ہمارے آباء کی غفلتوں ہی سے کٹ چکا ہے
نئے سویرے کا منتظر ہے
کہ جس کی آمد کے بعد ہر سُو
بہار ہوگی

بہار،
جس کے جلو میں
محنت کا اجر ہوگا

بہار،
جس کے جلو میں
خوفِ خزاں نہ ہوگا ———

ہم اس وطن کے لئے
جو رقبے میں گھٹ چُکا ہے
ہمارے آباء کی غفلتوں ہی سے کٹ چُکا ہے
جو ہر گھڑی،

اُس نئے سویرے کا منتظر ہے

پسینہ اپنا بہا رہے ہیں ——————

وطن کی مٹی میں

بیج محنت کے بو رہے ہیں ——————

اُنہیں مُبارک ہو

اُداس مائیں،
کہ اتنے عرصے سے
اُترے چہروں سے
بچھڑے بیٹوں کی راہ تکتی تھیں ——————
اُنہیں مُبارک ہو
ان کے بیٹے اب آرہے ہیں
شفیق ماؤں کی سوگواری کے ختم ہونے کا وقت آیا

اُداس بہنیں
کہ اتنی مدّت سے
اپنے پیارے جوان بھائیوں کے واسطے
مضطرب رہی ہیں
اُنہیں مبارک ہو
ان کے بھائی اب آرہے ہیں
خوشی کے چشمے
اب ان کے گھر میں بھی پھوٹ نکلیں گے

وہ بیویاں
جو ترس گئی تھیں کہ
اک نظر
اپنی زندگی کے شریک ساتھی کو دیکھ پائیں
اُنہیں مبارک ہو
ان کے ساتھی اب آرہے ہیں
جن آنگنوں میں
اُداسیاں رقص کر رہی تھیں

وہاں پر اب
قہقہوں کی بارش برسنے والی ہے

وُہ دل شکستہ،
اُداس بچے
کہ اتنے عرصے سے
اپنے پیارے بہادر ابُّو کو ڈھونڈتے تھے
اُنہیں مبارک ہو
اُن کے ابُّو اب آ رہے ہیں
اب اُن کی ساری اُداسیاں ختم ہو رہی ہیں
اور اُن کے ہنسنے کے دن بہت جلد آ رہے ہیں

وُہ لوگ،
ہم جن کے منتظر تھے
جو اپنی پیاری شفیق ماؤں
اداس بہنوں،
کی صورتوں کو ترس گئے تھے
جو اپنی غمناک بیویوں
اور اداس بچوں سے دُور بیٹھے تھے،

ان سے ملنے کو مضطرب تھے
مگر ارادے،
جو اس تھے ان کے
وہ عزم و ہمّت کے زندہ پیکر
کہ جن کے عزمِ جواں پہ ہرگز نہ آنچ آئی
اُنہیں مبارک ہو ———
ہم اُن کی راہوں میں
اپنی آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں
اُن کی آمد کے منتظر ہیں
اور ان کے عزمِ جواں کے ہر آن معترف ہیں

چُپ گھری چُپ

کہاں ہیں،
وُہ آباء و اجداد کی ساری قدریں کہاں ہیں

کہاں ہیں،
نگہبان ان ساری اقدار کے ———

کہاں ہیں وہ طارق سے بیٹے،
کہ کھوئے ہوئے اپنے ورثے کو ڈھونڈیں

کہ یاں سب کے سب
ہم سفر،
رہنما،
خود غرض اور خود بیں ہیں
بے حس ہیں اور بے خبر ہیں

یہاں ہر قدم پہ
عداوت کے طوفاں ہیں
اور سر تا سر نفرتیں خیمہ زن ہیں
کہ اب حق شناسی کو بھی
گمرہی ہی کہیں
اور حق گو کو باغی کہیں
کہ یاں سب کے سب
ہم سفر،
رہنما،
خود غرض اور خود بیں ہیں
بے حس ہیں اور بے خبر ہیں
ہمیں ساری اس صورتِ حال میں
وقت کا حکم یہ ہے
کہ سب کچھ سہو،
چُپ رہو
کہ چُپ،
گہری چُپ ہی تو
طوفان کا پیش خیمہ بنے گی

سال کی آخری سانس

مری سمت دیکھو،
مَیں اک فاصلہ ہُوں
مَیں اک سانحہ ہُوں
کہ جس کا تاثر
کسی اہلِ دانش نے سمجھا نہیں ہے ——————
مَیں دم توڑتے سال کی آخری سانس ہُوں
جو ابھی چند لمحے ہوئے
پھڑپھڑاتی ہوئی مضطرب رُوح کے ساتھ
بے چین تھا،
آخری ہچکیاں لے رہا تھا ——————

المیہ

محفلیں عیش و طرب کی،
رقص گاہوں کے ہجوم
عشرتوں کے سارے ایواں؛
شادمانی کے محل
سب کے سب موہوم ہیں،
ان کی بِنا کچھ بھی نہیں ــــــــ
سانس کی اک آمد و شد پر
یہ سارا سلسلہ
موقوف ہے ــــــــ

پُوچھنے والا کوئی نہیں ہے

خون کی ہولی،
کھیلیں بے شک
کمزوروں کا حق بھی چھینیں
چُنری جس کی چاہے اُتاریں
ساری زبانیں گُنگ ہیں
سب پہ تالے لگے ہیں
پُوچھنے والا کوئی نہیں ہے

ازلی جستجو کا نوحہ

زمانے میں
ہر شخص کو اک نہ اک شخص کی جستجو ہے
جو اس کے لئے بے غرض ہو
مگر اس کی خواہش،
ہمیشہ سرابِ مسلسل رہی ہے
کہ لوگوں کو
اک دوسرے کو سمجھنے، پرکھنے کی فرصت کہاں ہے

شعورِ انا

زمیں پر
اُفق تا اُفق پھیلتے،
آسمانی سمندر کی
مُنہ زور،
بپھری ہُوئی،
وحشی موجوں کے ریلے
مری سمت آئیں
مجھے کیا ——

زمیں سے،
فلک تک پہنچتے ہوئے
دیو صورت،
پہاڑوں کو دہلانے والی،
تناور،
درختوں کو جڑ سے ہلا دینے والی،
ہوا کے غضبناک جھونکے
مری سمت آئیں
مجھے کیا ———

چمکتے ہوئے
سُرخ سُورج کی
جھُلسانے والی،
دہکتی شعاعیں
میرے سر پہ نیزے کی چبھتی انی بن کے برسیں
مجھے کیا ———

مجھے

وحشی موجوں،
غضبناک جھونکوں،

دہکتی شعاعوں

کے ڈر سے

کہیں بھاگنا تو نہیں ہے ——————

مرا اصل دشمن

نہ یہ وحشی موجیں،

نہ یہ تند جھونکے،

نہ یہ تیز کرنیں ——————

مرا اصل دشمن

تو خود میرے اندر چھپا ہے

جسے خوب پہچانتی ہوں،

اُسے زیر کرنے کے انداز بھی جانتی ہوں

میرے بھائی

سُن ری سکھی
تو روز ہے پُوچھے
کون ہے وُہ جو
تیری کومل کویتاؤں میں مدھر مدھر رس گھولتا ہے
تو کتنی انجان ہے پگلی
یہ سیدھی سی بات بھی تیرے من میں نہ آئی
میری کومل کویتاؤں میں مدھر مدھر رس گھولنے والا
صرف وہی سنگیت ہے
جو میرے ویروں کے پیار کے تاروں سے
ہر لحظہ پھوٹتا رہتا ہے

دُوسروں کو سُکھی دیکھنے کی خواہش

مَیں

ہمدردیوں کی طلب میں

کبھی خود پہ جھیلی ہوئی ،

سختیوں کی کہانی نہ دہراؤں گی

مجھے
سُکھ کی خواہش لیے
بے گناہی کے کِس کِس جہنم سے
اب تک
گزرنا پڑا ہے،
کسی کو نہ بتلاؤں گی

کہ

خود تو دُکھی ہوں،
زمانے کو
دُکھ کی کہانی سُنا کر دُکھی کیوں کروں

بے خطا

عجب لوگ ہیں،
کہ جن کی نظر میں
محبّت کی،
محنت کی،
دُکھ سُکھ بٹانے کے جذبے کی
کچھ منزلت ہی نہیں ——

وُہ جانکاہ محنت کو
بے لوث خدمت کو
سچّی محبّت کو
اور سچّے لوگوں کی سچّی دُعاوں کو بھی
شک کی نظروں سے ہی دیکھتے ہیں
کہ ان کی نظر میں تو
کوئی بھی جذبہ غرض سے تہی ہو ہی سکتا نہیں
مگر اس میں ان کی خطا بھی نہیں ہے
کہ وُہ ہر کسی کو،
فقط اپنے ہی دل کے آئینے میں دیکھتے ہیں
جو اغراض کی گرد سے
اَٹ چکا ہے۔——

اندیشے

سوئیں کیسے

آنے والی کل کی فکریں

پل پل جان جلاتی ہیں

آؤ ــــ اپنے اپنے اندر جھانک کے دیکھیں

اک ایسے سچّے اور مخلص شخص کی خواہش تو سب کو ہے
جو سچّے جذبات کی باتیں سچے دل سے سُننا اور سمجھتا ہو
اور دُکھتے دِلوں پہ
اپنی میٹھی اور سچّی باتوں سے مرہم رکھ دیتا ہو
لیکن اس خواہش سے پہلے
آؤ،
اپنے اپنے اندر جھانک کے دیکھیں
خود ہم کتنے مخلص ہیں ــــــــ
خود ہم کتنے سچّے ہیں ــــــــ
اور کس حدتک، دُکھتے دلوں پہ مرہم رکھنے کے خواہاں ہیں

سویرے کا خواب

زمانوں سے
ہم خواب بُننے میں مصروف ہیں
اُس سویرے کے
جس کی سحر روشنی کی پیمبر بنے ——————

سدا منتظر تھے
ہم اُس روشنی کے
جو سب آنگنوں میں برابر اُجالا کرے
ہم اس آرزو میں جیے جا رہے تھے
کہ یہ روشنی جو ہمارا مقدّر رہے ہے
اک روز سب آنگنوں تک بہر حال پہنچے گی
اور پھر یہی روشنی،
آنگنوں کے مکینوں کے چہروں پہ وُہ نُور مل دے گی
جس کی سفیدی زوال آشنا ہی نہ ہو گی
مگر اب وُہی ہم ہیں
جن کے سبھی خواب دُھندلا چکے ہیں،
جنہیں ہر طرف روشنی سے بھی صُورتیں
بلکہ تاریک چہرے نظر آ رہے ہیں
کہ جن کے حسیں خواب بھی کھو چکے ہیں ———

ذرّوں کے پہاڑ

ازل سے یہی ہو رہا ہے
کہ ہر آن
بہتے ہوئے وقت کے بحرِ ذخّار میں
کتنے طوفاں اُٹھے
جن کی ہیبت کا کوئی ٹھکانہ نہیں
جن کی اُٹھتی ہوئی تیز موجوں کی رَو میں
ہر اک چیز
مانندِ خاشاک بہتی گئی
اور ابد تک،
اسی وقت کے بحرِ ذخّار میں
کتنے طوفاں اُٹھیں گے
جو اُٹھتی ہوئی تیز موجوں کی رَو میں
ہر اک چیز
مانندِ خاشاک لے جائیں گے ——

ازل سے یہی ہو رہا ہے

ابد تک، یہ ہوتا رہے گا ——

مگر، ننھے منّے وہ ذرّے

جو اپنی حقیقت کو منوا سکیں گے

پہاڑوں کی مانند قائم رہیں گے ——

اُنہیں کوئی خطرہ نہیں ——

نئی آزمائش

بجا ہے کہ سیلاب
جس سمت کو بھی گیا ہے
تباہی مچاتا گیا ہے ———
مکانوں کو ڈھاتا،
ہری سبز فصلوں کے
نام و نشاں تک مٹاتا
گذرتا گیا ہے
ہزاروں کو بے گھر بناتا
کسی تُند خُو اژدہے کی طرح
کف اُڑاتا گیا ہے

مگر ہم تو عادی ہیں
ہر آزمائش کے ـــــــــــ
یہ سیلاب بھی
کوئی قہرِ خدا تو نہیں ہے
نئی آزمائش ہے ـــــــــ
ہمارے ارادوں کا،
ہمّت کا،
جہدِ مسلسل کا
اک امتحاں ہے

جس طرح اس سے پہلے بھی
ہر آزمائش سے ہم
سرخرو ہو کے نکلے ہیں
اس آزمائش سے بھی
سرخرو ہو کے نکلیں گے ـــــــــ
شناور رہیں ہم بحرِ ہمّت کے
ڈوبیں گے بھی تو
قوی ہو کے اُبھریں گے ـــــــــ

راستوں کا بوجھ

شہر کی ہر جگمگاتی راہ پر
چمکیلے کپڑوں میں سجے،
کچھ لوگ یوں پھرتے ہیں
جیسے ساری راہیں
بس انہی کے واسطے پیدا ہوئیں ——

اور ان تھوڑے سے لوگوں کے سوا
ہر جگمگاتی راہ پر، وُہ لوگ ہیں
جو چلتی پھرتی زندہ لاشیں ہیں
جو بارِ زندگانی اپنے کندھوں پر لئے
مضمحل سے جا رہے ہیں اپنی منزل کی طرف
اور
آنکھوں میں کوئی موہوم سی خواہش لئے
کاروانِ زندگی کے ساتھ
بڑھتے جا رہے ہیں
لیکن ان کی صورتیں دیکھیں اگر
تو صاف کھُل جاتا ہے، ان لوگوں کی منزل کچھ نہیں
یہ راستوں کا بوجھ ہیں

مَیں کسی خود فریبی کی قائل نہیں

مَیں،
بھلا، کیوں اُنہیں
نام دُوں دوستوں کا
جو ناواقفِ مہر ہیں
اور محبت کی بنیاد سے لابلد ہیں ——————

مَیں ،
بھلا کیوں انہیں
دوست کہہ کر پکاروں
کہ جن کے تنوں پر لبادے تو ہیں دوستی کے
مگر دوستی اُن کی اندر سے بالکل تہی ذات پر
ایک الزام ہے

نہیں
مَیں انہیں دوست ہرگز نہیں مانتی ،
مَیں کسی خود فریبی کی قائل نہیں ——————

وجُود کا کشف

مرے گھر کی سب کھڑکیاں بند کر دو،
سبھی مشعلوں کو بُجھا دو
کہ کوئی کرن روشنی کی،
ہوا کا کوئی سرد جھونکا
مرے گھر میں داخل نہ ہو
کہ
مَیں نے بہت راہ ان کی تکی ہے
اُمیدوں کا دامن ہمیشہ کھُلا ہی رکھا ہے
مگر انتظارِ مُسلسل کے باوصف،
اب تک مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکا
اور دل اُن کو پانے کی خواہش لئے،
ہر گھڑی جس طرح سے جیا ہے
اُسے کِس طرح نام جینے کا دُوں

مَیں اب اِن مسائل سے اُکتا چکی ہُوں
یہ دل گہری مایوسیوں کے مقابل کھڑا ہے
مگر ڈگمگانے لگا ہے
مَیں اب ایک برزخ کے عالم میں ہُوں
اور یہی چاہتی ہُوں
کہ گھر کی سبھی کھڑکیاں بند کر دُوں،
سبھی مشعلوں کو بُجھا دُوں
کہ اب راہ تکنے کا یارا ابھی مجھ میں نہیں ہے
مجھے اب ہواؤں کے جھونکوں کی،
اور روشنی کی تمنّا نہیں ہے

مگر،
کِس نے پھر میری کھڑکی کا پردہ ہلایا!
مری رُوح کی خلوتوں میں دبے پاؤں آیا!

آئینہ در آئینہ

مَیں شب کی سیاہی میں دُکھ کی گپھا میں گھری
جب اپنے پہلو میں کُرسی پہ بیٹھے ہوئے بھائی کو دیکھتی ہُوں
کہ وُہ صرف بھائی نہیں ہیں،
مرے دوست بھی ہیں،
مرے باپ بھی ہیں،
مرا پیار بھی ہیں

تو یہ چاہتی ہوں
کہ مَیں ان کی کِس کِس محبت کو،
کِس کِس عنایت کو لفظوں میں ڈھالوں
کہ جذبے کو اظہار کا نام دینا بھی چاہت کی توہین ہے

اِدھر میں تو شب کی سیاہی میں دُکھ کی گپھا میں گھری،
آنسوؤں کے ستاروں سے پلکوں کو روشن کیے ہوں
اُدھر وہ ہیں، جو مجھ سے بڑھ کر پریشان و بے چین ہیں
مگر ان کی پلکوں پہ کوئی ستارے نہیں ہیں
کہ وہ ان ستاروں کو آنکھوں کے رستے سے،
دِل میں گرانے اور ان کو مسلسل چھپانے کا فن جانتے ہیں
مجھے دُکھ کی گہری گپھا میں گھِرا دیکھ کر
جانے کِس کِس طرح ساری شب میرا دُکھ بانٹتے ہیں،
مرے قلب کے بوجھ کو اپنے اور اپنے جیسے،
بڑے دِل کے لوگوں کے قصّے سُنا کر گھٹاتے ہیں
اور کِس سلیقے سے مجھ کو زمانے کی تاریک راہوں میں
روشن ارادوں کی مشعل سے چلنے کی خاطر
نئے عزم سے آگہی بخشتے ہیں!

وہ جس سچّے جذبے سے اور گہری شفقت سے
اس فرض کو اپنے ذمّے لئے رات بھر جاگتے ہیں
اُسے نام دینا بھی چاہوں
تو میرے لئے ایسا کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے

مگر سوچتی ہوں، کہ خود میں نے ان کے لئے کیا کیا ہے
کہ میں جانتی ہوں
وہ روزِ ازل سے دکھوں میں گھرے ہیں
اور ان سب دکھوں میں، مرے دکھ بھی شامل ہیں
جن کے لئے وہ مسلسل تڑپتے ہیں
لیکن کبھی اپنے چہرے پہ ان کی جھلک تک بھی لاتے نہیں
مگر میرا دل، جو انہیں چاہتا ہی نہیں، پوجتا ہے
مسلسل خداوندِ عالم سے ہے استطاعت کا طالب
کہ جس سے میں اُن کے لئے
کوئی خوشیوں کا تحفہ فراہم کروں

مَیں سخن ور نہیں

مجھے تم سخن ور نہ کہنا
سخن کی مرے داد ہرگز نہ دینا
کہ اس داد کا حق مجھے تو نہیں،
ان دُعاؤں کو ہے
جو شب و روز،
سائے کی صورت مرے ساتھ ہیں ———

میرا ذوقِ سخن،
میرا فن،
جو بھی ہے
اس کی تہ میں
فقط ان حقیقی دُعاؤں کے
اور شفقتوں کے خنک سائے کا
ہاتھ ہے
جن کا منبع مری مادرِ مہرباں ہے

سو مَیں اپنے فن کی بدولت،
کبھی خود کو فنکار کہتی نہیں
اصل فنکار وہ ذات ہے
جس کی اک زندہ تخلیق خود میں ہوں،
اور جس کے ہونٹوں سے

میرے لئے،

میرے فن کے لئے،

ان دُعاؤں کا چشمہ رواں ہے

جو دل جانتا ہے

کہ مقبول ہیں

زاہدہ صدّیقی کی تصانیف

تہذیبِ ذات اور تزئینِ کائنات کا جمالیاتی سنگم

جاگتی آنکھوں کا خواب	(اُردو نظمیں)
سفینہ اور سمندر	(اُردو غزلیں)
سچ کا زہر	(اُردو نظمیں)
پنکھڑیاں	(اُردو فردیات)
سویرے دی تاہنگھ	(پنجابی کلام)